کچھ لکھو ہم نظر انداز کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ ہم میں ورڈزورتھ ہے' ہم میں احمد ندیم قاسمی ہے' ہم میں قراۃ العین حیدر ہے' شوکت صدیقی ہے اور الطاف فاطمہ ہے۔ لکھو لکھو ضرور لکھو تم ہماری طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتیں کہ ہم تو تمہارا احساس ہیں' شعور ہیں۔

تو میں کیا کروں؟ آپ چونکہ خود فنکار ہیں' ادیب ہیں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پھر کیسی بے چینی' خلش اور خلا خلا میں محسوس کرتی ہوں اور اس وقت تک سکون نہیں ملتا جب تک کہ کچھ نہ کچھ لکھ نہ لوں۔ جناب میں نے کئی افسانے لکھے اور پھاڑ دیئے۔ دل کی تسلی اور اطمینان نہ ہو سکا جیسے یہ کچھ نہیں کچھ اور کروں' کچھ اور کروں پھر میں نے گزشتہ دنوں ایک ناول لکھنی شروع کی۔ مجھے صرف لڑکے اور لڑکی کی محبت کی کہانیاں پسند نہیں جیسی عام طور پر ہمارے عورتوں کے رسالوں اور ناولوں میں ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے محبت بھی زندگی کا' انسانوں کا ایک اہم جزو ہے مگر حقیقتیں کچھ اور بھی تو ہیں۔ دلفریب بھی' دل شکن بھی تو کچھ ایسے ہی خیالات اور پلاٹ یا مرکزی باتیں تھیں میرے ذہن میں جب میں نے اپنی کتاب لکھنی شروع کی۔ میں خود بھی حیران رہ گئی اور آپ بھی یہ جان کر حیران ہوں گے کہ جب میں نے کاغذ اور قلم سنبھالا تو خیالات' جذبات' الفاظ' مناظر' کردار سب کچھ میرے ذہن میں اس تیزی سے' اس خوبصورتی اور تسلسل سے آتے گئے اور کاغذ پر سنورتے گئے جیسے کہ یہ سب اصل واقعات' حالات کردار میرے دماغ میں کسی قید خانے میں تھے اور رہائی کے اس شدت سے منتظر تھے کہ دروازہ کھلتے ہی دوڑتے ہوئے باہر آنے شروع ہو گئے۔ میری والدہ اکثر مجھ پر ناراض ہو جاتیں' جھنجھلا جاتیں کہ تم کیا کرتی رہتی ہو۔ یہ کیا لکھتی رہتی ہو۔ مجھے بتایئے کہ میں انہیں کیا جواب دے سکتی تھی یا دے سکتی ہوں۔ خیر اب جب کہ یہ کتاب مکمل ہو گئی ہے (رف ہے ابھی) تو مجھے جیسے ایک بھاری بوجھ سے نجات مل گئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ چھپے' یہ چھپنے کے قابل ہے الماری میں پڑے پڑے ضائع ہو جانے کے لیے نہیں ہے مگر سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں' ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل بے کار کتاب ہو' محض میری خوش فہمی ہو کہ یہ ایک اچھی تحریر ہے اور قابل اشاعت ہے.. کوئی اچھا ادیب یا نقاد ہو سکتا ہے کہ اسے

پڑھے تو مجھ پر ہنسے گویا مجھے بالکل پتہ نہیں کہ میری یہ تحریر کیا ہے' سونا ہے یا پیتل۔

آپ سے میں اسی سلسلے میں مدد چاہتی ہوں کیونکہ میں آپ پر آپ کی انسان دوستی اور انسانیت پر اعتماد کر سکتی ہوں۔ مجھے آپ سے توقع ہے کہ میری کتاب کا مسودہ اگر آپ کے خیال میں قابل اشاعت نکلا تو آپ اس میدان میں ایک بے بس اور بے سہارا دیہاتی لڑکی کی تخلیق چرائیں گے نہیں (سنا ہے کہ اکثر بے ضمیر لوگ نئے مجھ سے غریب لکھنے والوں کے ساتھ یہ کرتے ہیں) بلکہ کسی اچھے پبلشر سے اس کی اشاعت کے سلسلے میں میری مدد کریں گے' طریقہ کار بتائیں گے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا' کیا کر سکتی ہوں' میرے پاس بینک میں بارہ چودہ سو روپیہ بھی ہیں میرے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں اگر اس سے بھی کچھ ہو سکے تو کوئی بات نہیں مگر میں اپنے قلم کو اظہار ضرور دینا چاہتی ہوں' ضرور دینا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ یہاں اس گاؤں کی اس چھوٹی سی حویلی میں جو میرا گھر ہے دفن ہو کر رہ جائے اسی لیے میں نے بہت سوچ سوچ کر آپ کو مخاطب کیا ہے کہ آپ ہی میری دانست میں واحد صحیح انسان ہیں' میں شکر گزار ہوں ٹی وی کی کہ آپ سے متعارف کرایا اور میں آج آپ کو یہ خط لکھ سکی۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ جواب سے نوازیں گے' منفی یا مثبت جو بھی ہو۔

والسلام۔

آپ کی مخلص۔

''نتالیہ''

اس کا خط روایتی اردو سے ہٹ کر روسی ادب کے ترجمہ شدہ ناولوں کی زبان میں تھا۔ ایک سید زادی اپنے آپ کو عیاں تو نہ کر سکتی تھی اس لیے وہ نتالیہ ہوگئی اور ایڈریس پر اس کے شکاری باپ کا نام تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہی ڈاک وصول کرتی تھی اور جان جاتی تھی کہ لفافے پر رودین کی تحریر ہے تو یہ اس کا خط ہے۔ اس میں کوئی خدشہ نہ تھا کہ شکاری جب اگر کبھی کبھار گھر موجود ہوتا تو ڈاک وصول کرنے کی ذمہ داری پھر بھی وہی نبھاتی تھی۔

وہ دن بھی تھے جب آستانۂ رومی تک آنے والی کچی سڑک کو راتوں رات پختہ کیا

جانے لگا..گلیوں میں پکی نالیاں بن گئیں..کوڑے کے ڈھیر اٹھا لیے گئے..وردی پوش گاؤں کے ہر گھر میں..ہر کھڑکی میں سے سرسری طور پر جھانکتے چلے جاتے..

یہ وہی دن تھے جب ''بابا'' کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان زمانوں کا ایک حکمران اپنی نقلی بتیسی پر بمشکل اپنے ہونٹ پھیلائے اپنی عیار مسکراہٹ کو بمشکل سمیٹتا' مونچھیں سنوارتا..آستانۂ رومی میں حاضر ہوا..

بہت روز بعد پتری نے بابا کی سفید داڑھی تلے جو فراخ سینہ تھا اس پر سر رکھ کر اتنے آنسو بہائے کہ ان کے لبادے کو گیلا کرتے ہوئے وہ ان کے سفید بالوں تک پہنچے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے ان سے پوچھا ''بابا..آپ نے اس دُرّے لگانے والے اور پھانسیاں چڑھانے والے بہروپیے کو کیوں آستانے میں آنے دیا..'' تو بابا نے زندگی میں پہلی بار شرمندگی سے کہا ''پتری اسے میں نے تو نہیں بلایا تھا..وہ خود آیا تھا..''

''آپ نے اسے کیوں آنے دیا تھا؟''

''آستانے پر کوئی بھی آ سکتا ہے پتری..''

''چاہے وہ بہروپیا ہو..''

''ہاں..کہ یہ فیصلہ کرنے والوں میں سے ہم نہیں ہو سکتے کہ کون روپ میں ہے اور کون بہروپ میں..آج کے روپ کل کے بہروپ ہیں اور آج کے بہروپ کل کے روپ بھی ہو سکتے ہیں..ہم فیصلہ کرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتے..''

''ہو سکتے ہیں بابا..ہم ہی فیصلہ کرنے والوں میں سے ہیں..اگر ہمیں اختیار نہیں تو اور کس کو ہے..''

''تُو تو سیانی ہو گئی ہے پتری..'' بابا نے اس کے گیلے رخساروں پر ایک بوسہ دیا ''تو تلاش میں ہے..اور یہ جان لے کہ آج جو فیصلے ہو رہے ہیں وہ کل کو باطل ہو جائیں گے..یہ بتا کہ سوان کا کوئی خط آیا ہے؟''

''ہاں..''

''وہ اسی طور ابل رہا ہے لاوے کی مانند پگھل رہا ہے..''

''ہاں بابا..وہ آپ کی مانند خلق خدا کے دکھ سے کٹ کر..لاتعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا..بابا اتنے برسوں سے آپ نے آستانے سے باہر قدم نہیں رکھا..آپ جانتے ہی نہیں کہ خلق خدا پر کیا

بیت رہی ہے.."

"پتری.." بابا نے اس کے گھنے سیاہ بنگالنوں ایسے بالوں پر ہاتھ پھیرا "تو تلاش کرتے کرتے کیسے واہموں میں گھر گئی ہے.." انہوں نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے پُتری پر چھاور ہوتے ہوئے کہا "ذرا میری داڑھی میں وہ پرندے تو تلاش کر جو اس میں گھونسلے بنائے بیٹھے ہیں.."

"نہیں بابا..اب میں بڑی ہوگئی ہوں..میں جانتی ہوں کہ آپ کی داڑھی میں پرندے نہیں ہیں..مجھے بے وقوف نہ بنایئے.." وہ جیسے ان سے روٹھ گئی..

"پرندے ہیں..جو تلاش کرنے والوں کو مل جاتے ہیں..گویا تو نے اپنی تلاش ترک کر دی..کیوں پُتری..؟"

"نہیں بابا.."

"ہاں..تو دیکھ تو سہی..واہموں سے باہر آ کر دیکھ تو سہی.."

اس کی آنکھیں بھی اس کے سیاہ بالوں ایسی سیال اور سیاہ جھیلوں ایسی تھیں..انہوں نے بے یقینی میں پلکیں جھپکتے دیکھا کہ بابا کی سفید ریشمی داڑھی کے بھیتر میں سے..اس کے بالوں میں سے مختصر اور ناخنوں جتنے چھوٹے چھوٹے پرندے خوش رنگ پرندے..پھڑ پھڑاتے ہوئے سفید بالوں کی دُھند میں سے نمودار ہو رہے ہیں..

کسی ایک چھوٹے سے پرندے کے گلے میں اس کے سیّد زادی ہونے کا طوق ہے..

ایک اور غم آسیب پنچھی کے گلے میں چاندی کی ایک صلیب لٹک رہی ہے..

اور..بابا کی سفید ریش میں سے برآمد ہونے والا ایک پرندہ ایسا بھی ہے جس کے بال و پر تمام تر سرخ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں..

ان میں سے کون سا پرندہ ایسا ہے جس کی نتالیہ کو تلاش تھی..

سارے پرندے..کچھ طوق گلے میں سہارتے..ایک صلیب کا بوجھ برداشت کرتے اور بیشتر سرخ رنگ میں رنگے ہوئے بابا کی داڑھی میں سے نکل کر اس کے..پُتری کے آس پاس پرواز کرنے لگے..وہ اس میں سے چہچہاتے ہوئے یوں غول کے غول برآمد ہوتے تھے جیسے چھتے کے چھیڑنے سے اس میں سے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی نکلتی ہیں..

وہ بہت مختصر اور چھوٹے چھوٹے تھے..انگلی کی پور کی جسامت اتنے..ناخنوں جتنے..

داڑھی کے سفید راکھ جنگل میں سے نکلتے اس کی سفیدی کے پس منظر میں ان کے پروں کے رنگ

آنکھوں کو خیرہ کرتے..

نتالیہ کی سیال آنکھوں میں جو بے یقینی اور اچنبھا تھا' وہ دھیرے دھیرے سکون اور یقین میں بدلا..

وہ ان کے چہچہاتے غول میں سے جو حجرے کے گنبد کو بھی بھر رہا تھا وہ پرندہ تلاش کرنے لگی جو اس نے آستانۂ رومی کے دنیا جہان سے کٹے ہوئے ماحول میں..سوان کے روانہ کیے ہوئے روسی ناولوں کے اردو ترجمے میں..اور اس کھلی سرسبز تنہائی میں جو ان کے گاؤں کے آس پاس اتری ہوئی تھی..اس میں اس نے..نتالیہ نے تخلیق کیا تھا..

اس کے کچھ جذباتی..رومانی اور کچے معیار تھے..انہیں مارکس اور لینن کی تعلیمات نے اور چاندی کی صلیب نے کسی حد تک پکا دیا تھا..سید زادی ہونے کی نسبت سے اس کی کچھ مجبوریاں تھیں جن سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتی تھی..اس خانقاہی ماحول سے بے شک جسمانی طور پر نہ سہی لیکن روحانی حوالے سے فرار ہونا چاہتی تھی چنانچہ اس نے اپنے لہو میں ایک اپنا من پسند تصوراتی روسی ناولوں کے کسی مڈل ایج کردار کی سوچ اور چال ڈھال ایسا ایک پرندہ تخلیق کر رکھا تھا..یہ اس کے لہو میں ہمہ وقت تیرتا تھا..اسے گہرا یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کا وجود ہے پر کہاں..

وہ اسی خود ساختہ..اپنی پسند کے رنگوں میں رنگے ہوئے پرندے کو بابا کی داڑھی کے گھنے پن کی سفیدی میں سے نکلتے ہوئے پرندوں میں تلاش کرتی تھی..

لیکن وہ وہاں نہیں تھا..

ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب بے انت ناخنوں پوروں جتنے پکھیرو جو اس کے بابا کی سفید ریش میں جانے کب سے..نسل در نسل چلے آئے تھے اور آج تک تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملے تھے' یہ سب اس کی..نتالیہ کی اپنی ذات کے پرتو تھے..عکس تھے..اسی لیے تو کسی کے گلے میں چاندی کی صلیب لٹکتی تھی..کوئی اپنے بھاری طوق کو مجبوراً سنبھالتا تھا اور کوئی شفق کی سرخی میں ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا..

اس کی سیال کھلی بھنورا سیاہ آنکھوں کے پانی گہرے اور اتھاہ تھے اور کسی ایک پرندے نے اس کی ناک کی قربت میں آ کر ان دو جھیلوں کو دیکھا اور وہ ان میں سے کسی ایک میں ڈوبنے کے لیے اپنی پرواز کا رخ بدل کر ان میں اتر گیا..یہ گویا اک اشارہ تھا کوچ کا نقارہ تھا' بقیہ پرندوں نے بھی اس کی پیروی کی اور آہستہ آہستہ سب کے سب حجرے کے گنبد سے ٹکراتے ایک زندہ

پھڑ پھڑاتے ہوئے بادل کی صورت نیچے آنے لگے..

غول کے غول رنگوں کے ڈھیر گرنے لگے..وہ سب نتالیہ کی کھلی آنکھوں میں اتر کر ان میں ڈوبتے گئے یہاں تک کہ حجرے میں کوئی ایک پرندہ بھی باقی نہ رہا..ان کی پرواز کی سرسراہٹ کا ایک واہمہ موجود رہا اور چند روئی کے ریشوں ایسے پَر جو دھیرے دھیرے نیچے آتے تھے اور نتالیہ کے گھنے بنگالی بالوں کی سیاہی پر اترتے تھے..

وہ اگر اس لمحے آئینہ دیکھ لیتی تو اپنے آپ کو آج سے تیس برس بعد دیکھ لیتی..

بال سفید ہو چکے تھے..روئی ایسے سفید ریشوں ایسے پَر انہیں ڈھانکتے تھے..

''تو نے دیکھا 'پتری..'' بابا نے اپنی ٹھوڑی نیچے کر لی اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو پروں کی سفیدی شاید ان کی ہتھیلی میں جذب ہو گئی ''تو نے دیکھا 'پتری..واہموں سے باہر آ کر دیکھا..''

نتالیہ نے شاید صدیوں بعد پہلی بار آنکھیں جھپکیں..''ہاں بابا..''

''اور ان میں وہ پرندہ نہیں تھا جس کی تو تلاش میں ہے..نہیں تھا؟''

بابا دلوں کے بھید جانتے ہیں..اس کے بدن میں خوف اور ندامت کی ایک لرزش لہر در لہر ٹھاٹھیں مارنے لگی..وہ ترگنیف کے ناول ''رودین'' میں سے زندہ ہوا تھا اور اس کے تخیل نے اس کی مانگ کی تھی..اور ایک سید زادی کے لیے اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ایک غیر کے خیال کو..اپنے لہو میں ایک پرندے کی مانند تیرنے دے..وہ جانتی تھی کہ ایسے بہت سارے فقیر اور بابے ہیں جو مر چکے لوگوں سے ان کے عزیزوں کو ملا دیتے ہیں اور وہ آپس میں باتیں کر سکتے ہیں..وہ سچ مچ نمودار نہیں ہوتے بلکہ ایک دھند کی صورت اس کمرے میں اترتے ہیں جہاں وہ فقیر کلام پڑھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں..اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ سائل کو اپنی روحانی قوت سے متاثر کرنے کی خاطر کوئی ایسا عمل کرتے ہیں کہ وہ اپنے آس پاس لاتعداد کبوتر اڑتے ہوئے دیکھتا ہے..ان کا حجرہ کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور غٹرغوں سے بھر جاتا ہے اور پھر پل دو پل میں وہ سب غائب ہو جاتے ہیں..کیا بابا بھی ایک ایسے ہی شعبدہ باز ہیں..

''پتری..تو شک کی دھند میں اتر گئی ہے..یہ تجھے متاثر کرنے کی خاطر نہیں تھا..اس میں میرا کوئی عمل نہیں..یہ تو خود تھی..سب کے سب تیرے سائے تیرے عکس تھے..تو بچپن سے انہیں میری داڑھی میں تلاش کرتی آئی ہے اور آج تو بے یقینی اور شک میں تھی اس لیے یہ نمودار

ہوئے تجھے یقین میں لے جانے کے لیے..اگر چہ ان میں وہ پرندہ نہیں تھا جو تو نے تخیل کی کنواری مٹی کو گوندھ کر بنایا تھا..نہیں تھا؟''

''نہیں بابا..''

''جان لے کہ یہ تجھے نہیں ملے گا..''

''میں..اپنے خاندان کی دوسری لڑکیوں کی مانند یونہی ایک بیکار اور بے مقصد زندگی بسر کر کے..خاوند کے آگے سر جھکا کر..یونہی خوابوں کے بغیر مر جاؤں گی؟''

''میں مستقبل میں نہیں جھانک سکتا پتری..غیب کا علم صرف خدا کو ہے..جان لے کہ یہ تیرے تصور کا پرندہ تجھے نہیں ملے گا..''

نتالیہ کا ڈر یکدم کافور ہو گیا..اس کے بدن کی لرزش تھم گئی..اس نے آنکھیں اٹھا کر بابا کے پر شفقت اور الوہی چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے آپ سے کہا..بابا آپ نہیں جانتے میں تصوّر کے اس پرندے کو پہلا خط لکھ چکی ہوں..مجھ پر وہ جن بلکہ شاہ جنات آ چکا ہے جو ہماری روایت میں ایک سید زادی پر آ ہی نہیں سکتا..وہ آ چکا ہے..

تسلیمات!

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے خط نے آپ کو بور نہیں کیا۔ جب کافی دن آپ کے خط کے انتظار میں گزر گئے تو میں نے سوچا مارو گولی! یہ سب شہرت یافتہ لوگ ایسے ہی مغرور اور فضول ہوتے ہیں۔ میں نے کیا حماقت کی کہ اپنے چالیس پیسے اور کاغذ اور الفاظ و خیالات ضائع کیے۔

مگر پھر آپ کا خط آ گیا یقین کریں کہ حیرت اور مسرت نے مجھے بالکل مبہوت سا کر دیا۔ آپ دلچسپ اور خوش مزاج انسان لگتے ہیں مگر ساتھ ہی حقیقت پسند اور صاف گو بھی۔

آپ نے مجھے لکھنے کے متعلق جو مشورے دیئے ہیں قابل غور ہیں اور میں ان کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔ آپ یقین کریں کہ میں لکھنے کے معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ناول ایک وسیع کینوس ہے لیکن جب آپ کے پاس حقیقت میں کچھ کہنے کو ہو مشاہدات اور احساسات کی گہرائی اور شدت ہو تو

یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے نا کہ آپ افسانوں کی چھوٹی چھوٹی ندیوں سے گزرے بغیر ایک دم سمندر کے کھلے پانیوں میں محو سفر ہو جائیں۔ مجھے علم ہے کہ اکثر کامیاب ناول نگار، افسانہ نگار پہلے بنے تھے اور بنے رہے لیکن ایسی مثالیں بھی تو ہیں خاص طور پر غیر ملکی ادب میں کہ لوگوں نے محض 15 سال کی عمر میں پہلی بار ہی ایک ناول لکھا اور مقام بنالیا۔ اگرچہ وسائل کے اعتبار سے ہمارے ملک میں کسی کے لیے ایسا کرنا بہت مشکل ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ذہن کے لحاظ سے ایسا ممکن ہو۔ آپ نے فرمایا ہے کہ ناول کے لیے تجربہ، مطالعہ اور عمر چاہیے اور مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق بھی ہے۔ تجربے کے لیے میرے خیال میں عمر کی قید نہیں ہوتی۔ اگر آپ کا ذہن حساس اور بیدار ہے، اقبال کے بقول آپ کے پاس ایک دیدۂ بینا بھی ہے تو آپ بچپن سے ہی تجربہ کار بننا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر آپ بے حس ہیں تو شاید عمر خضر بھی آپ کو ایک فنکار کا سا احساس و تجربہ نہ دے سکے۔

دوسری بات مطالعے کی ہے آپ کو کیا بتا سکتی ہوں یوں سمجھئے کہ میرے تمام پیسے عام طور پر فلموں یا میک اپ کی چیزوں یا کپڑوں کی بجائے عام طور پر کتابوں کی خرید یا کرائے پر خرچ ہوتے ہیں اور اچھی کتابوں پر۔ مثلاً میں نے آدم جی انعام یافتہ تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ قراۃ العین، عزیز احمد وغیرہ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ قاسمی صاحب کو پڑھا ہے۔ جوش تک کو پڑھا ہے۔ پہلے یہ سب کتابیں اکثر میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں مگر اب سمجھ آتی ہیں اور غیر ملکی ادب میں بھی بہت سے ادیبوں کو پڑھا ہے۔

خیر آپ کی تمام باتوں پر عمل کے طور پر میں نے سوچا ہے کہ اپنی ناول کو دو چار ماہ کے لیے بالکل بھول جاتی ہوں اور اس کے بعد دوبارہ پڑھوں گی (میں نے کہیں پڑھا بھی تھا کہ کسی تحریر کو مکمل کرنے کے بعد چند ماہ بعد پھر نظر ثانی کرنی چاہیے) اور پھر سکون سے خامیاں دور کر کے دوبارہ لکھوں گی اور آپ کو بھیجوں گی۔ لیکن اس سلسلے میں بہت سی قباحتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کیا ضمانت ہے کہ چند ماہ بعد بھی آپ مجھے یاد رکھیں گے اور یہ خاص طور پر یاد رکھیں گے کہ آپ نے میری کتاب پڑھنے اور مدد کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ آپ نے لکھا ہے کہ میں

کسی بھی اُمید کو دل میں جگہ نہ دوں تو اس کا تو مطلب ہے کہ میں لکھوں ہی نہیں۔ جب اُمید ہی نہ ہو تو لکھنے کا کیا فائدہ۔ تیسری بات پبلک ریلیشنگ کی ہے۔ آپ کو بتاؤں کہ گاؤں کا ماحول اور سادات سے تعلق (اور بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ جو اپنے ہونے والے ''مجازی خدا'' ہیں ان کا تعلق تو اسی علاقے کے ایک پیروں کے سلسلے سے ہے۔ دیکھئے میں کوئی بے شرم لڑکی نہیں ہوں لیکن چونکہ آپ سامنے نہیں ہیں اس لیے آپ کو اتنی ذاتی بات لکھ دی ہے لیکن اس اعتماد کے ساتھ کہ آپ اتنے وضعدار گھرانے کی ایک پردہ نشین لڑکی کے خط کو رسوا و عام نہیں کریں گے۔ آپ کے دل میں سادات کا کچھ نہ کچھ احترام تو ہوگا) یہ سب میرے لیے مشکلیں ہیں یا پابندیاں ہیں۔ میرا ماحول تو ایسا ہے کہ مجھے آپ کو خط ہی نہیں لکھنا چاہیے تھا' شاید غلطی کر رہی ہوں' شاید میرے اندر کوئی بڑی غلط لڑکی چھپی بیٹھی ہے' شاید لکھنا ہمارے خاندان میں غلط کام ہے۔ بہرحال میں کچھ کرنا ضرور چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے ادب میں۔

''نتالیہ''

رودین ایک آسیب کی مانند اس پر مسلط ہو چکا تھا.. ایک ان دیکھا شخص اس سے تقریباً دوگنی عمر کا ایک شادی شدہ شخص.. چار بیٹوں کا باپ جس کی اس نے آواز تک نہیں سنی تھی..

ٹیلی ویژن پر چند ادبی پروگراموں میں دیکھنا تو کوئی دیکھنا نہیں ہوتا.. کسی ادبی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اسے سننا تو کوئی سننا نہیں ہوتا.. ایک بالواسطہ دیکھنا اور سننا.. نہ دیکھنا ہوتا ہے اور نہ سننا..

واسطہ صرف خطوں پر لکھے ہوئے حرفوں سے.. اور ان حرفوں میں بھی اس کی جانب سے کوئی تسلی کوئی دلاسا نہ تھا.. بلکہ وہ کسی اور کا اسیر تھا.. کسی اور کی قید میں تھا اور وہ اس اسیری میں خوش تھا.. اس قید میں پُرمسرت زندگی بسر کرتا تھا.. اور وہ کڑھتی تھی.. ہر سویرا اپنے آپ کو آئینے میں تکتی تھی کہ میرے بنگالی بالوں گوری رنگت اور سیاہ آنکھوں کے تو ہر سو چرچے ہیں.. خاندان کے ہر لڑکے کی خواہش.. حصول کی خواہش وہ ہے تو وہ کون ہے جس کے لیے رودین ایسا وقف ہوا ہے کہ میرے لیے تسلی اور دلاسے کا ایک حرف بھی اس کے پاس نہیں.. وہ اس نامعلوم.. رودین کے عشق

خاص سے کوئی عداوت نہیں رکھتی تھی..اسے قبول کرتی تھی..اگر چہ بے حد حسد کرتی تھی..لیکن اس شراکت کو قبول کرتی تھی..

تسلیمات!

آپ کا عنایت نامہ مل گیا تھا۔ بے حد مشکور ہوں اور مسرور بھی تاہم ہنسی آتی ہے کہ میرا خط آپ جیسے انسان کے لیے ''بصیرت افروز'' (کہ آپ نے ایسا لکھا ہے) کیسے ہوگیا....بہر حال حُسنِ ظن یا ذرہ نوازی ہے آپ کی جو چاہیے کہیے ع جو چاہے آپ کا ذہنِ کرشمہ ساز کرے۔

اس خط میں آپ نے اتنی حیرت ناک' اتنی خوبصورت' اتنی یادگار سی باتیں لکھی ہیں کہ لگتا ہے جیسے آپ ''رُودین'' نامی روسی ناول کے رُودین ہیں بالکل (مرکزی کردار) جو کہ ایک بیوہ رئیس زادی کی دعوت پر اس کے گاؤں کے محل میں چند دن گزارنے آتا ہے اور اپنی باتوں' علم معلومات اور قابلیت والی دلنشیں گفتگو کے سحر سے اس کی بیٹی نتالیہ کے سادہ' نوخیز اور کم علم رکھنے والے معصوم دل و دماغ کو اس طرح مسحور کر ڈالتا ہے کہ آخر ایک دن اسے اس لڑکی کو اپنی شخصیت کے سحر سے آزاد کرانے اور حقیقتوں کی طرف لوٹانے کے لیے وہاں سے رات کو بغیر اطلاع کے روانہ ہونا پڑتا ہے۔ایسی منزل کی طرف جس کا پتہ ونشان وہ کسی کو نہیں دیتا پھر بالکل آخر میں وہ انقلاب کی جدوجہد میں مارا جاتا ہے۔

سوان میرا بھائی بھی کم عمری میں ماسکو گیا ہے یعنی اپنی اٹھارہویں سالگرہ اس نے وہاں جا کر منائی تھی اور سالگرہ کس طرح منائی تھی خوب تصویریں بھیجی تھیں ہمیں۔ یہاں تو ہم اس کی سالگرہ بس سادگی سے منا لیتے تھے اس کا جنم دن۔اور کیک کی بجائے امی کے پاس سُوت کی ایک سَت رنگی خوبصورت لڑی ہے اس میں ہر سال ایک چاندی کا Ring پرو دیتے ہیں۔ہائی سکول میں ہی اس کی دوستی اپنے ایک دوست کی وجہ سے بڑے بڑے عجیب وغریب لوگوں سے ہوگئی تھی جیسے دادا امیر حیدر...ان سب کی باتیں وہ صرف مجھے سناتا تھا اور میں یقین ہی نہ کرتی تھی مگر آخر ایک دن اس کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے یا

اپنے دوستوں کی مدد سے وہ پڑھنے کے لیے وہاں چلا گیا جہاں جانا ہمیں بالکل ناقابل یقین اور خواب لگتا تھا۔

اکثر میں چاہتی ہوں کہ میں اگر بزرگوں کی رضا و روایات کو نہیں توڑ سکی تو کاش میرا کوئی بھائی ہی ایسا کر دے اور دعا مانگتی ہوں کہ میرا چھوٹا بھائی ضرور باہر سے شادی کر لائے تو میرے لیے بے حد مسرت بخش بات ہو۔ آپ شاید ہنسیں میں سوچتی ہوں کہ اگر مجھ میں حوصلہ ہوتا اور حق حاصل ہوتا تو میں محض یہ روایت توڑنے کے لیے کہ ''غیر سیّد'' ہمارے خاندان میں شامل نہیں ہو سکتا کسی غیر سیّد سے ہی نہیں غیر قوم کے فرد سے شادی کر ڈالتی چاہے وہ کوئی نیگرو یا افریقی ہی کیوں نہ ہوتا۔

دیکھیں جناب آئندہ مجھے ''پیرنی'' جیسا فرسودہ اور دقیانوسی لفظ نہ لکھیں مجھے اپنے بابا (جو کہ اصل میں ہمارے تو دور کے رشتہ دار ہیں) اگر پسند ہیں تو اس لیے کہ وہ بہت مہربان، بہت میٹھے اور شفیق انسان ہیں۔ بے غرض ہیں کوئی نذرانہ وغیرہ لوگوں سے بالکل نہیں لیتے، بہت عابد و زاہد بھی ہیں، اتنے دھیمے اور میٹھے لہجے میں وقار سے گفتگو کرتے ہیں کہ آپ بالکل سحر زدہ پاتے ہیں خود کو۔ اور ان کی آنکھیں تو اتنی شفیق، اتنی مہربان، اتنی گہری لگتی ہیں کہ جب وہ آپ کی طرف دیکھتے ہیں تو آپ کا دل خود بخود ان کے قدموں میں جھکنے کو چاہنے لگتا ہے۔ دربار پر وہ رہتے ہیں ہمیشہ (جو ہمارے اور ان کے گاؤں کے درمیان میں واقع ہے تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ''آستانہ رومی'' کہلاتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر شاید صدیوں پہلے ہمارے بزرگ مشہد سے ترک وطن کر کے یہاں آئے تھے) میں اکثر جب بہت بیزار ہوتی ہوں دنیا سے اور اپنے آپ سے تو وہاں جاتی ہوں اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت سیر گاہ ہے۔ باغات، روشیں، گہری چھاؤں، خاموشی، سکون، تنہائی اور خوشبوئیں اور تتلیاں اور ہمارے بزرگوں کی قبریں مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے اور وہاں ہم صرف ایک چادر لپیٹ کر جا سکتے ہیں۔ بابا بھی مجھے بہت پسند کرتے ہیں اور بابا کا ٹوائیلٹ آپ حیران رہ جائیں اگر دیکھیں ایسا ہے جیسے کسی نواب کا (ان کے تربیلا کے کسی مرید نے بنوا کر دیا ہے) سنگ مرمر اور بہترین ماربل کی دیواریں اور فرش، فرانسیسی واشنگ بیسن وٹب وغیرہ اور اتنے بے شمار

غیر ملکی ٹوتھ پیسٹ' لوشن' کریمیں اور عطریات کہ چرانے کو دل چاہے مگر بابا خود کچھ بھی استعمال نہیں کرتے جو مرید باہر سے آ کر ٹھہریں اور معزز ہوں وہ استعمال کرتے ہیں۔ میں جب بھی جاتی ہوں بہت سعادت مندی سے بابا کے لکھائی پڑھائی کے کچھ کام کر دیتی ہوں (جن سے سب بھاگتے ہیں) اس لیے وہ مجھ پر زیادہ مہربان ہو جاتے ہیں۔ ان کے تمام ذاتی کمروں اور مہمان خانے میں بھی کبھی کبھی گھومتی رہتی ہوں۔ ایک دفعہ بہت مزہ آیا کہ جو خاص مقبرہ ہے بابا کے والد کا ایک گنبد میں وہاں عام عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی مگر میں جا سکتی ہوں تو ایک شام میں وہاں گئی کہ اگر بتیاں اور موم بتیاں لگا دوں جا کر تو وہاں ایک شخص ہلکی گرم چادر کندھوں پر ڈالے قرآن پاک پڑھ رہا تھا۔ اتنا محو تھا کہ اسے میرے اندر جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا اور سفید ٹوپی کے نیچے اس کے کچھ لمبے لمبے براؤن سنہرے بال بہت خوبصورت تھے اور ایسی ہی مونچھیں تھیں تھوڑی تھوڑی (بعد میں اس کی آنکھیں بھی براؤن نکلیں) وہ سورۂ رحمان پڑھ رہا تھا بآواز بلند... پھر ختم کر کے جب اس نے دعا مانگی' سر اٹھایا تو مجھے وہاں کھڑے دیکھا اور میں نے اندازہ کیا کہ سخت حیران رہ گیا۔ میں دل میں بڑی خوش یونہی کھڑی رہی تو اس نے گھبرا کر ایک دم پوچھا اور حیرت ہے کہ صاف اردو میں مگر پٹھانی لہجے میں کہ تم کون ہو یہاں عورتوں کا اندر آنا منع ہے۔ پتہ نہیں کیسے میں بھول گئی کہ میں بابا کی عزیز ہوں اور میں نے بڑے سکون اور شرارت سے اسے کہا میں وہی ہوں جن کا ذکر ابھی تم نے سورۂ رحمان میں پڑھا ہے (آپ کو بھی پتہ ہوگا کہ سورۂ رحمان میں جنوں اور حوروں کا ذکر ہے) آپ یقین کریں کہ وہ اس قدر بوکھلایا' ایک دم کھڑا ہو گیا اور مجھے دیکھتا رہ گیا۔ تب میں نے سوچا کہ اس پر رعب جما دوں کہیں یہ کوئی نامناسب جواب نہ دے کہ آخر میں بابا کی عزیزہ ہوں۔ اس لیے میں نے سنجیدگی سے کہا کہ میں یہاں آ سکتی ہوں کیونکہ یہ مقبرہ میرے نانا کا ہے اور بڑھ کر مزے سے اگر بتیاں لگانے لگی اور اس کی طرف دیکھا تک نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ وہ تھوڑی دیر یونہی کھڑا رہا جیسے سکتے میں ہو گیا ہو۔ یہ بات سن کر اور مجھے پشیمانی اور شرمندگی ہونے لگی کہ میں نے سورۂ رحمان والی بات کیوں کہہ دی تھی۔ میں پہلے ہی

اسے سچ بتا دیتی' اب وہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں.. پھر وہ چپ چاپ باہر نکل گیا البتہ جاتے جاتے دروازے میں سے اس نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا مجھے اور افسوس کی بات یہ تھی کہ تب میں خود بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ بس اس کے بعد میں نے اسے کبھی وہاں نہیں دیکھا' پتہ نہیں وہ کون تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں یہ واقعہ کبھی بھول نہیں سکتی بھلا آپ ہی بتائیں اتنا خوبصورت واقعہ کوئی بھلا بھول سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود وہ بھی نہیں بھول سکے گا۔

''نتالیہ''

ایک مڈل ایج شادی شدہ.. چار بیٹوں کا باپ شخص اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اسے کسی اور کے حسن اور اسیری کی داستانیں سناتا تھا.. اور اس کے باوجود وہ اپنے تخیلاتی رودین کے عشق سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی.. اپنی کوکھ میں صرف اس کے بچے کی آرزو کرتی تھی.. یہ بے وجہ اور بے جواز لگن اسی لیے تھی کہ وہ ایک نادیدہ عشق کے ہاتھی تلے روندی جا چکی تھی.. اس نڈھی کے تھاؤں تھائیں بھی عشق یوں بولتا تھا کہ بابا کو بھی خبر ہوگئی تھی..

سٹرینج آر دے ویز آف لو..

محبت کے راستے بہت عجیب ہوتے ہیں..

لیکن یہ راستے کچھ زیادہ ہی عجیب تھے..

ان میں اگرچہ عمر کا کچا پن.. خانقاہی ماحول کی گھٹن.. کانونٹ کے برآمدوں میں چلتے ہوئے مریم کے مجسّمے کو دیکھ کر.. یکدم رک کر اس کے سامنے سر جھکا دینے کی بے اختیار خواہش.. مارکس اور لینن کے اقوال اور روسی ناولوں کا ماحول اور کردار شامل تھے.. پھر بھی یہ راستے کچھ زیادہ ہی عجیب تھے..

یہ راستے اتنے عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والے تھے کہ وہ اپنے احساس گناہ سے کبھی نجات حاصل نہ کر سکتی.. نہ اسے دیکھنا نہ اسے سننا اور محض خطوں کے رابطے سے اس کے سامنے اپنے دل کو کھولنا.. ہر رگ اور شریان میں اس کی.. اس رودین پرندے کی موجودگی کا اقرار کرتے چلے جانا..

یہی احساس گناہ تھا جو اسے رلاتا تھا اور وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی.. شاید

یہ لذت گناہ تھی جو اس خانقاہی ماحول اور خاندانی حسب نصب کی جکڑ بندیوں میں اسے زندہ رکھے ہوئے تھی..

سال بھر میں صرف ایک شب آتی ہے..شب عاشورہ..

وہ آپا ثریا کی سیاہ پوشی کے برابر میں.. بابا کے حجرے کے باہر بیٹھی ہوئی..خود بھی ایک ماتمی سیاہ شلوار اور قمیض میں جو اس کے گورے رنگ پر خوب پھبتی تھی وہ قرآن پاک سامنے رکھے اپنی سیال آنکھیں مقدس ترین حرفوں پر رکھے..انہیں پڑھتی جاتی ہے اور سیال آنکھوں کے اندر جتنی بھی جھیلیں ہیں' ان کے پانی آنسوؤں کی صورت میں مقدس اوراق پر ٹپ ٹپ گرتے چلے جاتے ہیں اور ان کی نمی سے وہ آیات گیلی ہو کر کچھ کا کچھ مطلب نکالتی چلی جاتی ہیں۔ جب بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں ''پتری..غم حسین میں تو کوئی اتنا نہیں روتا..تجھے کیا غم ہے..''

بابا دلوں کا حال جانتے تھے اس لیے اس نے کچھ نہیں کہا..صرف قرآن پاک پر اپنی سیال آنکھوں کو بچھایا تو وہاں آیت تھی ''پس ہم حال جانتے ہیں تمہارے دلوں کا..مگر تمہارے لیے پہچان ہے ہر چیز میں..تم علم سے کیوں نہیں دیکھتے..''

'تو بے شک سب دلوں کا حال جانتا ہے لیکن تُو میرے ایک اس دل کا حال کیوں نہیں جانتا..

اس نے..نتالیہ نے صرف یہ سوچا اور پھر مزید روتے ہوئے گڑگڑا کر معافی مانگی کہ میں نے یہ کیسا سوال کر دیا ہے..

بابا چپ اسے دیکھتے رہے..قرآن پاک پر جھکے اس نے اپنے آنسو چھلکاتے ہوئے اور پھر انہوں نے اپنی سفید ریش پر ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں وہی کہا جو وہ کہہ چکے تھے..'پتری..غم حسین میں تو کوئی اتنا نہیں روتا..تجھے کیا غم ہے..''

محمد علی ڈاکیا..اتنی طویل مدت کے بعد اس بنگالی آنکھوں کی حامل ایرانی خدوخال والی..کہ اس کے بزرگ وہیں سے آئے تھے اور اپنی نسل میں ملاوٹ نہیں ہونے دیتے تھے..اس خاتون کا خط بھی تو لا سکتا تھا..

یہ خاتون ایک مفروضہ نہیں..ایک فرضی خیالی کردار نہیں..

فرضی اور تخیلاتی کردار کبھی اتنے جاندار..اتنے ناقابل یقین..اتنے عام زندگی کے بس

میں نہ آنے والے اور عجیب نہیں ہوتے..

ایک مصنف ایک خاص حد تک ہی فرض کر سکتا ہے.. تخیل کی پرواز بھی ایک محدود دائرے کے باہر جانے سے قاصر ہوتی ہے.. ایک کردار تخلیق کی ایک قید میں ہی سانس لے سکتا ہے۔ اس کے باہر لے جانے سے وہ مردہ ہو جاتا ہے.. جب تک کہ اس میں حقیقت کے نشے کی آمیزش نہ ہو..

تو یہ کردار اس خاص حد سے پرے.. محدود دائرے میں سے نکل کر.. اس تخیلاتی پرواز کی حدیں عبور کر کے تبھی زندہ رہتا ہے جب اس میں حقیقت کے کچھ عکس ہوں..

اس حقیقت کا ادراک تب ہوتا ہے جب اس کردار کا پیرایۂ اظہار اور لہجہ.. لکھنے والے کے پیرایۂ اظہار اور لہجے سے بغاوت کر کے خود ایک الگ راستے پر چل نکلتا ہے.. باغی ہو جاتا ہے..

نتالیہ کا جو لہجہ تھا.. وہ سراسر بغاوت کے حروف سے آراستہ تھا..

یہ خط ایک تخیلاتی رودین کو لکھے گئے...

ایک حقیقی نتالیہ کی جانب سے...

تسلیمات!

ویسے آپ کو بتاؤں میں خطوط کے معاملے میں گھر بھر کی ہی نہیں نصف گاؤں کی سیکرٹری ہوں۔ ہر روز کئی خطوط لکھنے اور پڑھنے پڑتے ہیں جو عورتیں لاتی ہیں یعنی وہ جو ملکۂ ترنم کہتی ہے ع چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے۔ تو شاید میرے جیسے لوگوں سے کہتی ہے۔ اس سب کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ میں اکثر رات کو سوتے سوتے بھی جاگ اٹھتی ہوں اور سوچتی ہوں میں کیا کر رہی ہوں۔ مجھے آپ کو خط نہیں لکھنے چاہئیں پھر اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اے رب تو جانتا ہے کہ میں کوئی گناہ نہیں کر رہی ہوں تو مجھے گھر میں سرخرو اور باعزت رکھنا جس طرح اب تک رکھا ہے تو جانتا ہے کہ میرے دل میں کوئی بری بات نہیں۔ اگر گھر والے جان جائیں کہ میں آپ کو اس قسم کے خط لکھتی ہوں تو یہ ان کے لیے اس قدر حیرت ناک اور غیر متوقع بات ہو جیسے کہ کوئی کہے کہ امام خمینی نے شاہ کو تخت واپس کر دیا ہے۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

آپ کا خط اس قدر جلد ملا کہ میں حیران رہ گئی پھر اتنا اچھا' اتنا مہرباں خط کہ یقین فرمائیں بار بار پڑھتی ہوں اور ہر بار ایک نئی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر میں آپ کو خط نہ لکھتی تو اس عجیب خوشی سے کبھی آشنا نہ ہو سکتی جو اتنا پیارا خط پا کر کسی کو ہو سکتی ہے۔

ویسے مجھے آپ کا یہ خط پڑھ کر زیادہ احساس ہوا کہ آپ بالکل روسی ناول کے ہیرو ''رُودین'' کی طرح ہیں۔ اُسی طرح حقیقت پسند' ترقی پسند' ظلم کے خلاف اور ادیب۔ انسانیت اور آزادی کے پرستار۔ اسی طرح سنجیدہ اور عالمانہ باتیں لیکن خوبصورت اور پُراثر انداز میں اور اسی طرح اپنی عمر اور وقار کا احساس کہ رُودین نتالیہ (جو کہ صرف 18 سال کی تھی) سے تقریباً دگنی عمر کا انسان تھا اور ایک بار کسی بات پر باغ میں بیٹھے ہوئے کوئی بحث کرتے ہوئے وہ نتالیہ کو بتاتا ہے کہ میرے یہ کنپٹیوں کے سفید بال دیکھتی ہو۔ انہوں نے مجھے بہت تجربات دیئے ہیں جبکہ تم یہ تجربے کبھی نہ کر سکو گی اور نہ ہی تمہیں کرنے چاہئیں۔

میں نے جو وقت کانونٹ میں گزارا' وہ آج بھی میرے لیے ایک خوبصورت ترین خواب کی طرح ہے کہ دوستوں سے زیادہ مجھے خود کانونٹ پسند تھا۔ شفاف طویل برآمدے چکوتروں اور لیموں کے درختوں سے بھرا گھنا باغ' سرخ بجری کی روشیں' گھنی پھولدار جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی پُراسراری اور ان کے سائے میں چپس کی بنچیں جہاں انسان گھنٹوں خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہے پھر ایک پہاڑی (مصنوعی) پر مقدسہ مریم کا رنگین قد آدم (پتھر کا) مجسمہ گود میں حضرت عیسیٰ اور قدموں میں ایک گڈریے کا مجسمہ جھکا ہوا۔ پھر سکول کے باغ کی ایک دیوار ٹاپ کر ہم ملحق چرچ میں جا سکتے تھے وہاں چھپ کر اندر چوروں کی طرح دبے پاؤں چپ چاپ حضرت عیسیٰ کے بڑے بڑے مجسّموں اور تصویروں کے درمیان گھومتے رہنا مجھے بہت پسند تھا۔ غرض کانونٹ میں میرے لیے اتنی خوشیاں ہوتی تھیں' چھوٹی چھوٹی کہ میں انہیں آج بھی بھول نہیں سکتی۔ نیلی اور گہری براؤن آنکھوں والی سفید لبادوں میں ملبوس مدرز اور سسٹرز اور فادرز سب لوگ اتنے شرمیلے' مقدس سے' میٹھے

سے، دھیمے سے اور شفیق... آپ کو بتاؤں کہ وہاں سے میٹرک کر کے نکل آنے کے بعد میں ہمیشہ سنجیدگی سے سوچتی تھی کہ کاش میں ایک Nun بن سکتی۔ اپنی مدر ٹھنتی یا سسٹر جینٹا کی طرح لیکن جب مجھے اچھی طرح علم ہو گیا کہ ہمارے مذہب میں ایسی کوئی گنجائش نہیں تو مجھے بڑا افسوس ہوا جو آج بھی ہوتا ہے۔ چلیں پھر Nun بننے سے تو مذہب نے روک دیا تو پھر میرا آئیڈیل تھا کہ بہت مشہور صحافی خاتون بنوں، بہت تیز اور سرگرم قسم کی۔ ہر وقت مصروف عمل رہنے والی، ہر فنکشن، ہر مقام پر موجود یا پھر کوئی بہت مشہور شاعرہ بن سکوں۔ تمام مشاعرے اٹینڈ کرنے والی مگر میری یہ دو خواہشات بھی بالکل ناقابل عمل ہیں تو پھر بتایئے کہ میں کیا کروں۔ مجھے یہی خیال اکثر ہر چیز سے بے زار کر دیتا ہے کہ میں اپنی مرضی کے خلاف ایک بالکل عام اور روایتی زندگی گزار کر مر جاؤں گی اور گویا بالکل رائیگاں جاؤں گی۔

ہماری فیملی بلکہ برادری کو اس بات پر بڑا فخر اور طمانیت ہے کہ انہوں نے اپنی نسلوں کو ملاوٹ سے محفوظ رکھا ہے مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ اس حفاظت کی قیمت کس طرح ادا کی گئی ہے۔ اس طرح کہ ہماری کئی عزیز ایسی بھی ہیں جو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور ان کی شادی محض اس وجہ سے نہیں کی گئی تھی کہ برادری میں کوئی لڑکا نہ تھا اور غیر برادری کا سید بھی قابلِ قبول نہ تھا پھر یہ مثالیں بھی ہیں کہ بیویاں شوہروں سے دس بارہ سال تک بڑی ہیں اور بعض دفعہ شوہر بیویوں سے بیس سال تک بڑے ہیں اور سب مان لیتے ہیں۔ لڑکے تک کوئی بغاوت نہیں کرتے (البتہ میرا خیال ہے کہ ایسا بے جوڑ رشتہ سوان کبھی نہ مانتا مگر خوش قسمتی سے اس کے لیے ایسا ہے بھی نہیں)

بابا اور آستانۂ رومی کے بارے میں آپ نے جو اشتیاق ظاہر کیا ہے مجھے وہ بڑا حیران کن لگا۔ میں نے سوچا کہ ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کہ آپ ہمارے مہمان ہوں اور میں ایک گائیڈ کی طرح آپ کو دربار کا گوشہ گوشہ دکھاؤں شاید اگر آپ کی سوان سے دوستی ہو سکی تو پھر مہمان تو آپ ہمارے بن جائیں اور دربار بھی گھوم لیں مگر میں خود آپ کی گائیڈ تب بھی نہ بن سکوں گی حالانکہ یہ ایک بالکل بے ضرر خواہش ہے۔ میری شہر کی جو ایک دو سہیلیاں ہیں وہ کبھی اپنے مہمانوں کو لے کر

ہمارے گاؤں آتی ہیں پھر دربار پر جانے کی ضد ضرور کرتی ہیں۔ بڑا اچھا لگتا ہے انہیں بھی وہاں کا ماحول۔ پھر ہم وہاں جاتے ہیں اور بابا میری سہیلیوں کے خیال سے فوراً کسی خادم سے نفیس بلوریں پیالیوں میں قہوہ بنواتے ہیں (وہ ہمیشہ قہوہ ہی پلاتے ہیں چائے وغیرہ نہیں) خوشبودار اور مزیدار اور ساتھ مٹھائی' بسکٹ جو کچھ اس وقت میسر ہو سب کو اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں۔ اپنے خاص کمرے میں بٹھاتے ہیں سب عزیزوں کو باہر بھیج کر۔ پھر ہم سب باہر آ کر باغ میں ایک گھاس کے چوکور خوبصورت قطعے میں بنے سنگِ سرخ کے چبوترے پر مزے سے جوتے اتار کر پیر اُوپر کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور خوب ہنستے اور باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ بابا کے دونوں خاص بوڑھے مرید یا خادم جو ازل سے ہم نے وہیں دیکھے ہیں پریشان اور خوفزدہ پھرتے رہتے ہیں کیونکہ اس چبوترے پر بابا کے علاوہ اور کوئی نہیں چڑھ سکتا اور لوگ اسے بوسے دیتے ہیں مگر ہم پرواہ نہیں کرتے اور بابا بھی دھیمی مسکراہٹ سے نظر انداز کر جاتے ہیں مگر ہم ایسا صرف جبھی کرتے ہیں جب دربار پر باہر کے مرید ٹھہرے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے آپ کو بتاؤں بابا کو لوگ مانتے بہت ہیں۔ دُور دُور سے بھی آتے ہیں اور اکثر اپنی مرادیں پاتے بھی ہیں۔ کئی مرید اُن کے بہت امیر بھی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نے بابا کو مقبرے کے لیے ایران سے بہت خوبصورت دروازہ منگوا کر دیا ہے۔ بہت قیمتی اور رنگین کام کا۔

خمینی کی طرح وہ بھی زمین پر سوتے ہیں اور ان کی خواب گاہ میں ہاتھ کی بنائی ہوئی حضرت علیؓ کی ایک قدیم تصویر بھی ہے جو کہ کہا جاتا ہے کہ مشہد سے بزرگوں کے ساتھ آئی تھی۔ جب ہم وہاں جاتے ہیں تو اُسے چومتے ہیں مگر آپ کو بتاؤں میں نے اور سوان نے دل سے اس کی اصلیت پر زیادہ یقین کبھی نہیں کیا ہے۔ بابا کی ایک خوبی یہ بھی مجھے پسند ہے کہ وہ شیعہ اور سنّی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ اہلِ شیعہ سے زیادہ ان کے سنّی مریدین ہیں اور وہ اپنی زبان سے کبھی کسی کو بُرا نہیں کہتے حالانکہ ہمارے بعض عزیز کہتے ہیں کہ یہ ان کی مصلحت ہے مگر جو کچھ بھی ہے یہ حقیقت ہے کہ وہ دربار پر عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم کا عرس بھی کرتے ہیں جو کسی بھی شیعہ درگاہ پر کبھی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے لوگ مانتے ہیں انہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ بابا بھی آپ کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس خوبصورت بات پر کہ سچ جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے کسی ایک جگہ نہیں ہے۔ میں ان دنوں محسوس کرتی ہوں کہ اگرچہ خمینی بہت اچھے انسان ہیں مگر جب وہ ظلم کرواتے ہیں، روزانہ گولیاں لوگوں کو اڑاتی ہیں تو دکھ مجھے بھی محسوس ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ میں ایک گھریلو سی لڑکی ہوں۔ مجھے ان سب باتوں سے کیا غرض مگر میں جیسے مجبور ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ فوجی بوٹوں نے کوڑوں اور مارشل لاء کے سر پر لوگوں کے ہونٹ سی دیئے ہیں، پتھر بنا دیئے ہیں لیکن کب تک۔ مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن آستین کا لہو ضرور پکارے گا۔ البتہ اس بات کا مجھے کامل یقین ہے کہ الیکشن ہوئے تو ہمارے گاؤں سے سوائے ملاؤں کے دو چار ووٹوں کے اور کوئی ووٹ کم از کم اتحاد کو ہرگز نہ ملے گا۔ عورتیں ابھی تک اس شہید کے لیے روتی ہیں اور اسے بھولتی نہیں ہیں حالانکہ یہ سب غیر سیاسی محنت کش لوگ ہیں جنہیں اس نے شاید کچھ بھی نہیں دیا تھا ماسوائے اس شعور اور احساس کے کہ وہ بھی انسان ہیں، ایک طاقت ہیں، برابری کا حق رکھتے ہیں اور مانگ سکتے ہیں اور یہی اس کا کارنامہ ہے کہ اس نے جان دے دی مگر لوگوں کو یوں جگا دیا ہے کہ اب وہ کبھی نہ سو سکیں گے۔ ہر عورت تک سیاست کی بات کرتی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے یا گوبر تھاپنے والی جاہل بے خبر عورت بھی۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ نے میرے خط کا جواب جان بوجھ کر نہیں دیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ میرے خط نے آپ کو ناراض کیا ہو۔ کیونکہ وہ جو میرے اندر کوئی خود پسند روح چھپی بیٹھی ہے وہ کہتی ہے کہ تم اتنی غیر اہم تو ہو نہیں کہ تمہیں کوئی بھی اس قدر جلد بھلا دے۔

لیکن آپ کی بات اور ہے آپ کچھ اور شخصیت ہیں اور میرا آپ سے رابطہ بھی صرف قلمی رہا ہے اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ واقعی مجھے بھول بھی چکے ہوں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر آپ مجھے خط لکھنا نہیں چاہتے تو بھی کوئی بات نہیں کیونکہ آپ ایک بے حد بے حد بے حد اچھے انسان ہیں اس لیے اگر آپ میرے خط کا جواب نہیں دے رہے تو اس میں ضرور میری کوئی بہتری ہوگی کیونکہ کسی کے ساتھ کوئی بُرائی یا تکلیف دینے کا کام تو آپ کبھی کر ہی نہیں سکتے۔

میں چاہتی تھی کہ آپ کو سال نو کی مبارکباد دوں اور ایک خوبصورت کارڈ کے ساتھ دوں لیکن ایک تو موسم اس قدر بدترین ہے کہ شہر جانے کا سوال ہی نہیں اور پھر والد صاحب نے کہا کہ بھائیوں کو بھی نئے سال کے مبارکبادی کارڈ نہ بھیجو کہ یہ ہم مسلمانوں کا رواج نہیں ہمارا سال تو محرم سے شروع ہو جاتا ہے۔

آپ بے شک میرے خط کا جواب نہ دیں میں انتظار نہیں کروں گی ویسے مجھے اس بات پر افسوس ضرور ہے کہ آپ نے اب مجھے بھی ان بے شمار لوگوں میں شامل کر ڈالا جن کے خطوط کے جواب آپ نہیں دیا کرتے اور جواب نہ دے کر یقیناً آپ مجھ سے آپ کو خط لکھنے کا حق واپس لے رہے ہیں اس لیے خودداری کا تقاضا یہی ہے کہ میں بھی اب یہ حق استعمال نہ کروں۔ خدا حافظ۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

گزشتہ خط میں نے آپ کو کس طرح کسی آزاد پرندے جیسے ہلکے پھلکے پن، سرخوشی اور بے فکری کے ساتھ لکھا تھا مگر وہ خوشی کس قدر جلد ختم ہوگئی ہے۔ میں تھک کر دوسری منزل پر واقع سوان کے نئے بنے ہوئے کمرے میں آرام کر رہی ہوں اور میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جب کہ میں شیشوں کے پار کھڑکیوں سے باہر دیکھتی رہی ہوں۔ اتنی اُداسی اور بیزاری کے ساتھ کہ بس مر جانے کو دل چاہے اور ہر چیز، ہر انسان بُرا لگے اپنے گرد و پیش کا زندگی کا۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت دنوں بعد اس دفعہ مجھ پر اُس بے حد اُداسی اور کوفت اور تنہائی کا کوئی دورہ پڑا ہے کہ جس میں بس یا تو دل چاہے کہ مر جاؤ یا بلاوجہ ہی خوب رونے کو دل چاہے۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی بہت شفیق اور مہرباں ہستی ہو جو مجھے سمجھتی ہو، میری بیزاریوں اور اُداسیوں کو سمجھتی ہو